ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کے تصوّرِ فقہِ آفاقی پر ایک ناقدانہ نظر(۱)

* ڈاکٹر شہزاد اقبال شام

تغیّر الاحکام بتغیّر الزمان (۲)

علوم طبعی (Physical Sciences) کے مباحث ہوں، یا سماجی علوم (Social Sciences) کے نظریات زیر بحث آئیں، جو چیز کسی لمحۂ معلوم میں عدم سے وجود میں آتی ہے، اسے قرنوں بعد دیکھیں تو تعجب ہوتا ہے کہ ننھی سی کونپل نے کیسے تناور شجر سایہ دار کی ہیئت اختیار کر لی ہے۔ ذرا موازنہ کر کے دیکھیں، ہوائی جہاز کے اس ابتدائی نمونے کا جدید فضائی عفریت سے جو زقندیں بھرتے ہوئے صلوٰۃ القصر واجب ہونے سے پہلے دو برِاعظموں کی حدود سے نکل کر تیسرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور یہ جو چار چھ فقہی مسالک ......فقہ مالکی، فقہ حنفی، فقہ شافعی، فقہ حنبلی، فقہ زیدی اور فقہ جعفری...... آج اپنے پورے نکھار کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں، کیا تیرہ چودہ صدیاں پہلے ان کے اصول و قواعد اور متبعین اسی قوت و جوبن کے ساتھ موجود تھے؟ جس دقیقہ سنجی اور اور جزرسی سے ان کے اصول آج منقح ہو چکے ہیں، کیا یہ اسی شکل میں روزِ اوّل سے لوگوں کو مل گئے تھے؟ ''ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں'' کی بیل علوم کی ہر شاخ کے ساتھ لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ ارتقا ہی وہ اصل کلی ہے جو ازل سے آج تک ہر سمت میں نظر آتی ہے۔

ارتقا کا بیان آسان نہیں۔ اسے یہ نام تو دیا جا سکتا ہے لیکن اس کی رفتار، اس کا رخ اور اس کی ہیئت کا بیان آسان نہیں ہے۔ یہ اپنا سفر اقلیدسی شکلوں میں کرتا ہے۔ ارتقا خط مستقیم میں چلتے چلتے کسی لمحے اپنے لیے دائرے بھی وضع کر لیتا ہے۔ دائروں کے اس کسر و انکسار کا مطالعہ اوسط فہم کے کسی شخص کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ دائرے بنتے بنتے کبھی پھر خط مستقیم میں چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ فقیہ پیچھے دیکھ کر خط مستقیم، مثلث، مربع، مستطیل، مخمس اور دائرے کی چال سے ارتقائی سفر کو صفحۂ قرطاس پر تو بکھیر سکتا ہے لیکن ارتقا کب اچانک کوئی موڑ مڑ کر فکر کی وسعتوں کے نئے افق تلاش کرنے لگے گا، یہ معلوم کرنا فقیہ سے ذرا آگے فلسفی کا ہوا کرتا ہے۔ فقیہ لمحۂ محدود ......اور زیادہ سے زیادہ لمحۂ موجود...... کے زندان سے باہر نہیں نکلتا۔ فلسفی مآل کو دیکھ لیتا ہے کہ وہ ذرا بلندی پر کھڑے ہونے کے سبب اندازہ کر لیتا ہے کہ ارتقائی خط مستقیم کی راہ میں کہاں موڑ آ رہا ہے۔

ایسوسی ایٹ پروفیسر شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

ارتقا کی تکوین کن عناصر سے ہوتی ہے؟ اس کا انحصار موضوع سخن پر ہوا کرتا ہے، کوئی حتمی بیان دینا آسان نہیں۔ یہ دائروں کا ایک الجھا ہوا سفر ہے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ اس عالم بے بدل کی حیثیت ایک کُل کی سی ہے۔ یہ کُل لاتعداد کَل پرزوں کا مجموعہ ہے۔ آلات واوزار اس کُل میں اسباب ہوا کرتے ہیں۔ اصول تغیر انہیں متغیر کردیتے ہیں۔ یہ نئی شکل اختیار کرتے ہی طبائع انسانی پر اثر ڈالتے ہیں۔ ہو نہیں سکتا کہ ٹیکنالوجی زبان و بیان (Etymology) کو متاثر نہ کرے اور زبان و بیان انسانی تعلقات کو متاثر نہ کریں۔ انسانی تعلقات فقہ انسانی کا موضوع ہیں۔ لہٰذا ٹیکنالوجی سے فقہ اسلامی کا متاثر ہونا بھی نوشتہ دیوار ہے۔ معاشرت کے باب میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زرعی معاشرے کی کلید قبیلے (Extended Family) کا اتحاد تھی۔ کوئی تصور ہی نہیں تھا کہ کسی شخص کے ماں باپ کی دیکھ بھال کرنے والا گھر سے باہر کا کوئی اجنبی (Nurse) ہو۔ فہم کا دائرہ یہ قبول ہی نہیں کرتا کہ بسلسلہ ملازمت کسی دوسرے شہر میں مقیم بیٹا عید کے ایام خاندانی و آبائی گھر میں مقیم ماں باپ سے دور کسی اور شہر میں گزار دے۔

زرعی معاشرے میں معاشرتی اکائیاں متحد الوجود تھیں لیکن ٹیکنالوجی کے بے پناہ ہجوم نے ان تمام دائروں کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیا ہے۔ ٹیکنالوجی نے صنعت وحرفت کو جنم دیا تو صنعتی دور کی اکائیاں انتشار کے مرحلے سے بھی نکل کر وجود سے عدم کی شاہراہ پر چل پڑی ہیں۔ صنعت وحرفت نے قبائل ختم کیے، خاندان کو منتشر کیا۔ نکاح کے تمام اداروں کو ختم کر دیا اور ماں باپ کو بیٹے کے گھر سے نکال کر اولڈ پیپل ہاؤس میں پہنچا دیا۔

معاملات کے ضمن میں نظریہ العقد کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکنالوجی اور بدلتے ارتقائی دائروں نے فقہ اسلامی کے موضوعات ہی بدل کر رکھ دیے ہیں۔ کاروباری تعلقات کے موضوعات محدود پیمانے پر شرکت و مضاربت سے نکل کر کروڑوں کی تعداد میں حصص کا لین دین کرنے والے لاکھوں افراد تک پھیل گئے۔ یہ کہہ دینا کافی ہے کہ کسر و انکسار کا یہ عمل جو گزشتہ چند صدیوں سے پیہم مسلسل کی راہ پر بگٹٹ دوڑ رہا ہے، اس نے اسلامی معاشروں پر قدرے تاخیر سے اثر انداز ہونا شروع کیا۔ اس کی دو بڑی وجوہ ہیں: اولاً مسلمان معاشروں میں صرف سلطنت عثمانیہ کا وجود ریاستی ادارے کی شکل میں اپنی بُری بھلی شکل میں بین الاقوامی برادری میں موجود تھا، ورنہ دیگر تمام معاشرے استعماری بندشوں میں جکڑے ہونے کے باعث ریاستی موضوعات سے ناآشنا تھے۔ ثانیاً مسلمان خود ٹیکنالوجی کے میدان میں اتنے پیچھے تھے کہ اکثر معاشروں میں بیشتر جدید مسائل پیدا ہی نہیں ہوئے تھے اور اگر ہوئے تھے تو وہاں کے فقہاء صدیوں کے جمود کے سبب یا تو ان کا ادراک نہ کر سکے یا ان کا حل سامنے لانے کے اہل ہی نہ تھے۔ زمانہ تو بدل گیا لیکن احکام نہ بدلے گئے کہ احکام بدلنے کی صلاحیت رکھنے والے یا تغیر کا ادراک کرنے والے مسلمان معاشروں میں ناپید ہو چکے تھے۔

اصول تغیرّ اور اصول فقہ

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو فقہ اسلامی کے ان دائروں کا سفر کم و بیش تیرہ صدیوں تک خط مستقیم کے رخ پر سفر کرتا رہا۔ اس سارے عرصے میں اصول فقہ کے دائرے بنتے بگڑتے اور ٹوٹتے پھوٹتے تو رہے لیکن یہ خط مستقیم سے باہر نہیں نکلے۔ لیکن جب صنعت و حرفت میں جدتّ آئی تو اس نے تمدن انسانی کو متاثر کرنا شروع کیا۔ فقہ اسلامی کے سفر کے رخ میں بتدریج تبدیلی آتی گئی لیکن اہل دانش اس کا ادراک نہ کر سکے اور یوں عبادات کی دہلیز سے آگے اسلام کا سفر کٹھن سے کٹھن تر ہوتا گیا۔ ادھر سیاسی اقتدار چھن جانے سے مسلمانوں کو ریاستی لیبارٹری میسر نہ رہی جس کے نتیجے میں کم و بیش ہر نیا فقہی نظریہ اسلام سے عقیدت کا انعکاس تو رہا، تعمیل کے باب میں وہ مسلمانوں کے لیے انعطاف کا کام نہ کر سکا۔ دوسری طرف صدیوں کے اس خلا کو دفعتاً پُر کرنا ناممکنات میں سے تھا۔

علامہ اقبال وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس صورت حال کا ادراک سب سے پہلے کیا تھا۔ فکر اسلامی کے جملہ ذخیرہ پر صدیوں بعد ناقدانہ نظر ڈالنے والے اس فیلسوفِ عہدِ حاضر کے خیال میں ''گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام کی مذہبی فکر عملاً جمود کا شکار رہی۔'' (۳)

یہاں پانچ سو سال کی مدت وہ دورانیہ ہے جس میں علامہ موصوف کے خیال میں فکر و فلسفہ کے سوتے خشک ہوتے نظر آئے ہیں۔ رہے فقہ اسلامی کے موضوعات تو ان میں تحرک ٹیکنالوجی کا محتاج رہا لیکن اہل نظر اس طرف متوجہ ہی نہ ہوئے۔ یہاں فقیہ نہ ہوتے ہوئے بھی علامہ اقبال بیسویں صدی کے نصف اوّل میں فقہ اسلامی کی بے چارگی کا علاج ان الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں۔

میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے ''جورس پروڈنس'' [اصول قانون] پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانے کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی ہی کا منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری رائے ناقص

میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا(۴)

مرض کی نشاندہی کرتے ہی علامہ اقبال نے اس مجددِ وقت ۔۔۔مجتہد مطلق مستقل (۵)۔۔۔ کی تلاش بھی شروع کردی اور متعدد لوگوں سے خط وکتابت اور تبادلہ خیال کیا جو ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔لیکن علامہ اقبال جس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکے، وہ یہ تھی کہ وقت کے بدلتے مزاج کے ساتھ ساتھ گزشتہ چند صدیوں سے فقہ اسلامی کا مزاج بھی بدل چکا تھا۔مسائل کے حل میں انفرادی کوششوں کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن صورت واقعہ یہ ہے کہ علمی دنیا میں مجتہد مطلق مستقل کا تصور اب قصہ پارینہ بن چکا تھا۔امام کا ادارہ سیاست شرعیہ میں تو ایک بدیہی حقیقت ہے لیکن علم اصول فقہ میں اب اس قدر تنوع اور رنگارنگی دیکھنے کو ملتی ہے کہ اب اس میں کسی فقہی قائدِ واحد کا تصور نا قابل قبول ہے۔فقہ اسلامی کے موضوعات میں پھیلاؤ نے محدود انسانی صلاحیتوں کی بے بضاعتی تھی صدی ہجری ہی میں واضح کردی تھی۔

فقہ اسلامی کا اساسی ارتقاء

تاریخ فقہِ اسلامی کے طلبہ خوب واقف ہیں کہ فقہِ اسلامی پر امام غزالیؒ کا ایک بہت بڑا احسان ہے۔انہوں نے مجتہد مطلق مستقل کے ادارے کو اجزا میں تقسیم کر کے فقہی اختیارات کی مرکزیت کو مختلف سمتوں میں وسعت دے دی اور لامرکزیت والا آج کل کا معروف نظریہ (Decentralization of powers) بعنوان ''تجزؤ الاجتہاد'' بایں الفاظ متعارف کرایا:

> ((ولیس الإجتهاد عندی منصباً لایتجزأ بل یجوزان یقال للعالم بمنصب الإجتهاد فی بعض الاحکام دون بعض فمن عرف طریق النظر القیاسی فله ان یفتی فی مسئلة قیاسیة)) (٦)
>
> ''میری رائے میں اجتہاد ایسا منصب نہیں ہے جس کے اجزا نہ ہوسکیں، بلکہ جو شخص بعض شرعی احکام کا عالم ہو اور بعض کا عالم نہ ہو، ممکن ہے اسے مجتہد قرار دے دیا جائے۔پس جو شخص قیاس کے اسلوب سے واقف ہو، اس کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی قیاسی مسئلہ ہی میں فتویٰ دے۔''

امام غزالی نے فقہ اسلامی کے سفر میں آنے والے اس موڑ کی بروقت نشاندہی کی جس کے بعد اس باب میں اختصاصی مطالعے نے رواج پکڑنا شروع کیا۔ اب ابواب فقہ کا عمومی علم رکھتے ہوئے فقہاء کی کوششوں کا رخ اپنے میلان کے مطابق مخصوص ابواب کی طرف ہو گیا مناکحات کے ماہر نے مضاربت کے امور کسی اور کے لیے چھوڑ دیے اور شراکت کا بیان تعزیرات والے نے اپنے لیے کسی حد تک شجر ممنوعہ قرار دیا۔ لیکن امام شوکانی غزالی کے اس نظریہ تجزؔوالا جتہاد سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں اجتہاد نا قابل تقسیم عمل ہے جو اپنی کلی شکل ہی میں کارآمد ہوتا ہے، اجزا میں منقسم ہو کر یہ اپنی افادیت کھو بیٹھتا ہے۔(۷) تاہم امر واقعہ یہ ہے کہ شوکانی کا نقطہ نظر فقہاء کی توجہ حاصل کرنے میں زیادہ کامیاب نہیں رہا اور امام غزالی کا نظریہ تجزؤالا جتہاد آج فقہ اسلامی کے ہر باب میں اپنی پوری آن بان کے ساتھ موجود ہے۔

یہ کہنا خاصا دشوار ہے کہ علامہ اقبال کی نظر اس سارے فقہی ذخیرے کی طرف نہیں گئی۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ محولہ بیان سے ان کی مراد یہ تھی کہ فقہ اسلامی کا کل ذخیرہ نظر ثانی کا متقاضی ہے اس کی شکل چاہے کچھ بھی ہو، تو بے جا نہ ہو گا۔

فقہ اسلامی کے کل ذخیرے پر گہری فقیہانہ نظر ڈالنے والا تیسرا شخص ڈاکٹر محمود احمد غازی ہے جس نے زندگی بھر کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ عہدِ حاضر کے مسائل کی کلید کسی ایک فقہ کے پاس نہیں ہے بلکہ ان کے خیال میں ایک ایسی آفاقی فقہ خود بخود متعارف ہو رہی ہے جس کی کیمیائی ترکیب جملہ مکاتب فقہ کے اجزا پر مشتمل ہے۔

فقہ اسلامی کے تین موڑ

چودہ صدیوں پر محیط فقہ اسلامی کے سفر پر نظر ڈالی جائے تو عقدہ وا ہوتا کہ اس طویل دورانیے کے سفر میں اب تک تین موڑ آئے ہیں۔

فقہ اسلامی کے اس سفر میں پہلے موڑ کی نشاندہی کرنے والے امام غزالی ہیں جنھوں نے اجتہادی عمل کو انفرادی کوشش کی سطح سے اٹھا کر مجتہدین کی اجتماعی بصیرت سے مربوط کر دیا۔ امام غزالی کے عہد تک ہر مجتہد کی حیثیت کسی حد تک ایک کُل کی سی تھی جس سے ہر باب میں معارف پروری کی توقع کی جاتی تھی۔ امام غزالی نے ابواب فقہ کو فقہاء کی جماعت میں تقسیم کر کے اسلوب تفکر کو متغیر کر دیا۔ امام غزالی جس عہد کے نمائندہ ہیں، اس میں فکر اسلامی اپنے درجہ کمال پر نظر آتی ہے۔ یہ زمانہ مسلمانوں کے عروج کا عہد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تجزؤالا جتہاد کے نظریے نے اس میں نکھار پیدا کر دیا۔

علامہ اقبال۔امام غزالی کے برعکس۔ایک ایسے عہد کے نمائندہ ہیں جسے نقطۂ زوال کا آخری کونا قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ عہد ہے جس میں فکر اسلامی پر اتنی گرد پڑ چکی تھی کہ علامہ اقبال کو بجائے خود اس عہد کا مصلح کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ علامہ مرحوم نے فی الاصل اصول فقہ کے پورے ذخیرہ کو ایک وحدت کے طور پر لیتے ہوئے محولہ بالا رائے دی تھی۔ علامہ کی خواہش اپنی اصل شکل میں تو پوری نہیں ہوسکی لیکن اس کی محرف شکل اگلے موڑ میں جلد ہی سامنے آ گئی۔

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ تیسرے موڑ کی نشاندہی کرنے والے پہلے شخص ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف جس عہد کے نمائندہ ہیں، اس کے دو مزید امتیازی خصائص ہیں: اولاً انسانی زندگی پر ٹیکنالوجی اور صنعت وحرفت کا بے پناہ رسوخ اور گہنائے ہوئے زرعی معاشرے کے ساتھ ساتھ پورے جوبن پر صنعتی معاشرے کا وجود اور ثانیاً ایک ڈیڑھ صدی کے بعد مسلم معاشروں کو حاصل سیاسی آزادی جس نے عملاً فقہی موضوعات کی لامرکزیت کو جنم دیا۔ ڈاکٹر غازیؒ نے جس عہد میں فقہ آفاقی کا تصور پیش کیا، وہ عہد عجائب اور فکری بے چارگی سے عبارت ہے۔ علامہ اقبال کو قرآن کی ابدیت ثابت کرنے والا مجدد تو نہ مل سکا لیکن ہیگل کی روح عصر (Geist) نے یہ کام ایک اور شکل میں کر دیا۔

عہدِ فقہِ آفاقی کی دو ندرتیں

ہیگل کی اس خوب معروف اصطلاح کو معاصرین نے ''عقل کل''، ''تصورِ مطلق وجود بالذات'' اور'' کائنات کا جوہر'' جیسے نام دیے ہیں۔ ان اصطلاحات سے اردو دان اہلِ علم کو Geist کا مفہوم مطلق تو نہیں ملتا کچھ ادراک ضرور ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وقت کے کسی مخصوص دورانیے میں خیالات، افکار، اور افعال واعمال کے جدل ومناظرے اور مکالمے سے ظہور پذیر یہ وہ ''روحِ عالم'' (Thesis) ہے جس کے اندر ہی سے اس کی ضد (Anti-Thesis) نکل کر نئی روح عصر (Systhesis) کی صورت میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اس اصول کا اطلاق ۔۔۔

اگر یہ درست ہے تو (۸) فقہ اسلامی پر کیا جائے تو ٹیکنالوجی، تہذیبی تغیر، فکری مکالموں اور ثقافتی تعامل نے فقہ اسلامی کے موضوعات بدل کر رکھ دیے ہیں۔ گویا جس روح عصر نے امام غزالیؒ سے نظریہ تجزؑ والا اجتہاد متعارف کرایا، صدیوں بعد وہی روح عصر ڈاکٹر غازیؒ سے فقہ آفاقی متعارف کرا رہی ہے (۹) لیکن ڈاکٹر غازی جس روح عصر کے نمائندہ ہیں، اس کے نمایاں خصائص سمجھے بغیر فقہ آفاقی کا سمجھنا کارِ عبث ہے۔ اس عہد کی دو نمایاں ندرتیں ہیں۔

پہلی ندرت: تزلزل اور ارتعاش

امام غزالی اور ہیگل وقت کے جن دورانیوں کے نمائندہ ہیں، وہ دورانیے تزلزل اور ہلچل سے خالی تھے۔ اگر یہ کہا

جائے کہ ان کے عہد میں مسائل کی نمائندہ سواری آج کل کی موٹر کار کے مقابلے میں اونٹ تھی تو غلط نہ ہوگا۔ اُدھر ڈاکٹر غازیؒ جس عہد میں لب کشائی کرتے ہیں اس کی کوئی مثال معلوم تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ اس عہد میں مسائل کا ارتعاش دھیمے سروں میں نہیں، یہ برقی رو عہد ہے۔ ذرا غور کیجئے خود ڈاکٹر غازیؒ نے کیا اپنی زندگی ہی میں سائیکل، موٹر سائیکل، موٹر گاڑی، ہوائی جہاز اور خلائی جہاز جیسی ایجادات واختراعات سے پیدا شدہ برق رفتار تبدیلیاں نہیں دیکھیں۔

مسائل کا سامنا تو انسانی زندگی ازل سے کرتی چلی آ رہی ہے اور ان مسائل کا حل بھی خود انسانوں کے ارباب دانش نکالتے چلے آ رہے ہیں۔ اس عہد میں تو یک طرفہ تماشا بھی ہوا۔ زندگی اس قدر تیز گام رہی کہ اس میں پیدا شدہ مسائل کا حل تو دور کی بات رہی، اس کے لیے مطلوب ذہنی ارتکاز کے دورانیے ہی میں ہمیں مسائل کی نوعیت بدلتی نظر آتی ہے اور جتنی دیر میں اس نئے مسئلے کے لیے انسانی ذہن یکسو ہوتا ہے، مسئلے کی نوعیت تبدیل ہو کر نیا مسئلہ بن جاتی ہے۔

ابھی چند دہائیوں کی بات ہے کہ مسلم معاشرے کے اہل دانش بدلتے صنعتی ماحول میں عورت کے پردے کی نوعیت پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ مباحثہ ابھی جاری تھا کہ فضائی میزبانی **(Air hosting)** کے شعبے میں عورت کا کردار زیر بحث آ گیا۔ اور گفتگو ابھی کسر وانکسار کے مرحلے ہی میں تھی کہ خود خاندان کے وجود پر ضربیں لگنا شروع ہو گئیں۔ سیاسی میدان میں دیکھتے ہی دیکھتے سوویت یونین معدوم ہوئی تو مزدور اور کسان کی آجر وجاگیر دار سے آویزش ختم ہوگئی، آجر ومستاجر کی چپقلش یک دم معدوم ہوگئی۔ استحصال کی اصطلاح ابھی صرف ایک ڈیڑھ عشرہ قبل مزدوروں کسانوں کے ضمن میں استعمال ہوتی تھی۔ بورژوائی معاشرہ، جلاؤ گھیراؤ، استحصال، روٹی کپڑا اور مکان، ریاست بطور آلہ جبر، عالمی انسانی مساوات، اجتماعی کاشتکاری، مزدوروں کسانوں کے حقوق اور ان جیسی کئی اصطلاحات کا یوں لگتا ہے، کوئی وجود ہی نہیں تھا اور بنی نوع انسان کے دونوں برسر پیکار طبقات ۔۔۔ مزدور اور صنعت کار ۔۔۔ یک دم باہم شیر وشکر ہو گئے۔ اس عہد میں مسائل کی نوعیت لمحاتی وجود کے ساتھ ظاہر ہوتے ہی شعلہ مستعجل بن جاتی ہے۔ یہاں تو تفکر اور تعقل کی اصطلاحات ہی معدوم ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ عہدِ فقہِ آفاقی کی پہلی ندرت ہے۔

دوسری ندرت: ماوراء الاقوام (Transnational) کارپوریٹ لین دین

اس عہد کی دوسری ندرت بھی بڑی حد تک ٹیکنالوجی ہی کا نتیجہ ہے۔ تیز رفتار فکری وعملی تعامل نے کم وبیش تمام فقہی موضوعات کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہی نہیں یہ عہد اپنے جلو میں نت نئے موضوعات کا ہجوم بھی لایا۔ فقہ اقلیات سے تو شاید علامہ اقبال بھی زندگی بھر نا آشنا رہے۔ عائلی زندگی میں آپ بڑے پیمانے پر دیکھیں گے کہ شوہر مالکی فقہ کا

مقلد ہے تو بیوی فقہ جعفری یا کسی اور فقہ کی اسیر۔ بین الاقوامی تجارت میں بائع فقہ حنفی کا پیروکار ہے تو مشتری فقہ شافعی کا متوالا۔ فیلسوف عصر امام غازی نے ان حالات میں فقہ اسلامی کے ذخیرے کا بغور جائزہ لیا تو روح عصر انہیں اس باب میں ایک نیا موڑ مڑتی نظر آئی۔ یہ کیفیت انہوں نے ایک مثال سے واضح کی۔

آپ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص محض یہ وعدہ (Promise) کرے کہ وہ کسی کی فیکٹری کی مصنوعات خریدے گا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ وعدہ واجب التعمیل (Enforceable by Law) نہیں ہے۔ یہاں لفظ وعدہ (Promise) کو عمومی معنوں میں نہ لیا جائے۔ یہ ایک قانونی وفقہی اصطلاح ہے جس میں کوئی صلہ (Consideration) نہیں ہوتا۔ اور صلہ نہ ہونے کی صورت میں متاثرہ فریق عدالتی چارہ جوئی نہیں کر سکتا۔ کاروباری دنیا میں اس فقہی رائے کا سہارا لیا جائے تو مطلوبہ نتائج نہیں برآمد ہوتے۔ ڈاکٹر غازی صاحب فرماتے ہیں کہ فرض کریں آپ ایک کمپنی شروع کرتے ہیں۔ پس لازم ہے کہ آپ اس کمپنی کا میمورنڈم آف ایسوسی ایشن تیار کر کے اسے سیکیورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن کے پاس رجسٹر کرائیں۔ یہ بتائیں کہ آپ کتنا سرمایہ لگانا چاہتے ہیں۔ کتنی رقم اب لگائیں گے اور کتنی بعد میں فراہم کریں گے۔ رجسٹریشن کے بعد کمپنی کے آرٹیکل آف ایسوسی ایشن بنائیں جن میں تفصیلی قواعد وضوابط ہوں۔ پھر اخبار میں اشتہار دے کر لوگوں سے رقم لگانے کو کہیں۔ لوگ اس میں کروڑوں اربوں روپے لگائیں گے۔ خود کمپنی بنانے والوں کی لگائی جانے والی رقم اس وقت تک لاکھوں کروڑوں سے متجاوز ہو چکی ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ وعدہ واجب التعمیل ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ احناف کے خالص نقطۂ نظر سے یہ محض ایک وعدہ ہے کہ سرمایہ کاری کرنے پر نفع ہوا تو سرمایہ کار کو ملے گا۔ اور یہ وعدہ احناف کے نقطۂ نظر سے واجب التعمیل نہیں ہے۔ اس صورت میں تو کوئی کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ اب اس پر غور ہوا تو معلوم ہوا کہ احناف کا یہ نقطۂ نظر اختیار کرنا کاروباری زندگی کی نشوونما روک دینے کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ فقہ مالکی سے رجوع کرنے پر معلوم ہوا کہ جس وعدے سے کوئی ذمہ داری (Liability) تخلیق ہوتی ہو، وہ واجب التعمیل ہے اور چارہ جوئی کرنے پر عدالت اس کی سماعت کرے گی۔ (۱۰)

صرف اسی پر موقوف نہیں، انسان نے صدیوں پہلے انفرادی حیثیت سے جس کاروباری زندگی کی داغ بیل ڈالی تھی، کچھ عرصے بعد معاشرتی ارتقاء کے باعث اس نے اجتماعیت یعنی شراکت داری (Partnership) کا رخ اختیار کر لیا۔ یہ شراکت داری طویل عرصے تک معاشرتی دائرے میں رہی لیکن پندرہویں صدی میں کمپنیوں کے تصور نے تجارتی دنیا کے موضوعات بدل کر رکھ دیے۔ اس کے باوجود یہ کمپنیاں طویل عرصے تک قومی ریاست

(National State) کے کرّے سے باہر نہ نکل سکیں اور یوں کاروبار ملکی تجارت سے ذرا آگے بین الاقوامی تجارت ہی سے آشنا رہا۔لیکن زر کے بے پناہ پھیلاؤ اور ریاستی حلقہ اثر سے نکل کر اسی زر کے کمپنیوں کے پاس آ جانے سے لگتا ہے کہ بین الاقوامی تجارت اور لین دین بھی کوئی دن کے مہمان ہیں۔ اب کاروباری حلقے بین الاقوامی (International) سے بہت آگے ماوراء الاقوام (Transnational) لین دین کے عہد میں قدم رکھ چکے ہیں جس میں انفرادی تو دور کی بات ہے، ملکی عمل دخل بھی دن بدن دھندلاتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

> اب جو ادارے اپنے نظریات کو فروغ دے رہے ہیں، وہ ملٹی نیشنل کمپنیاں اور بڑے بڑے بنک ہیں۔ ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف وہ ادارے ہیں جو غیر ریاستی ادارے ہیں لیکن مالیات اور تجارت ان کے ہاتھ میں ہے۔اس وقت دنیا کے مستقبل کو بنانے اور بگاڑنے کا یا دنیائے اسلام کو کنٹرول میں رکھنے کا جو سب سے بڑا ذریعہ ہیں، وہ یہ ملٹی نیشنل ادارے اور کارپوریشنز ہیں۔ ان کے پاس دنیا کی معاشی زندگی کی لگامیں ہیں۔ان کے پاس دنیا کے معاشی وسائل اور مالیاتی خزانوں کی کنجیاں ہیں۔ یہ ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف جیسے ادارے ہی ہیں جن کے بیشتر ممالک مقروض ہیں۔ اور جو مقروض ہوتا ہے وہ قرض دار کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ اس لیے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو آئندہ پچیس تیس سال یا چالیس سال ہیں ان میں ریاست کا کردار بنیادی نہیں ہو گا، مستقبل کا علم اللہ کو ہے، لیکن اندازہ یہ ہوتا ہے کہ آئندہ آنے والے سالوں میں ریاست کا کردار بنیادی نہیں ہو گا، بلکہ ان اداروں کا کردار بنیادی ہو گا اور یہ مالیاتی اور تجارتی ادارے میڈیا اور پبلسٹی کے اداروں کے ساتھ مل کر دنیائے اسلام کو کنٹرول کرنے کا فریضہ انجام دیں گے۔ آئندہ کے نقشہ میں بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ انہی دو اداروں کا کردار بنیادی ہو گا۔(۱۱)

فقہ آفاقی کو سمجھنے کے لیے قارئین آگے بڑھنے سے پہلے یہ دو نکات ذہن میں رکھیں تو مسئلے کی نوعیت سمجھنا آسان رہے گا۔

فقہ آفاقی ڈاکٹر صاحب موصوف کی نظر میں

علمی دنیا میں یہ ایک معروف اور مسلّمہ قاعدہ ہے کہ کسی شے کو اس کے کُل سے جدا کر کے نہیں لیا جا سکتا۔ ایسا کرنے کی صورت میں مقدمہ ادھورا رہ جاتا ہے اور مسئلہ سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔ یہی اصول مسلمانوں کے جملہ فقہی مکاتب فکر پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ اب ان مکاتب فکر کا ایک دوسرے سے لاتعلق رہنا ناممکن ہے۔ چار چھ سو سال قبل فقہ اسلامی کے مختلف رنگ مختلف علاقوں میں اپنی انفرادی آب و تاب سے دکھائی دیتے تھے۔ اس کیفیت کو بیان کر کے ڈاکٹر غازی صاحب یوں رقم طراز ہیں:

> آج سے پانچ سو سال پہلے اگر یہ ممکن تھا کہ فقہائے ماوراء النہر بعض معاملات میں شدت اختیار کریں اور کچھ دوسرے فقہاء دنیا کے بعض دوسرے علاقوں میں انہی معاملات کے بارے میں نرمی اختیار کریں، اور یہ نرمی اور شدت بیک وقت دنیائے اسلام میں رائج العمل رہے، یہ اس دور کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق تھا لیکن آج ایسا ممکن نہیں ہے۔ آج اگر دنیا کے کسی بھی گوشے میں بیٹھا ہوا فقیہ کوئی شدید رائے اختیار کرتا ہے یا کوئی ایسا نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے جو کسی احتیاط پر مبنی ہونے کی وجہ سے عامۃ الناس کی نظر میں مشکل قرار دیا جائے تو اس کے نتیجے میں پوری دنیا میں فقہ اور شریعت پر تنقید اور تبصرے کا ایک طویل ردِعمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے منفی اثرات پوری دنیائے اسلام پر اور خاص طور پر ان لوگوں پر پڑتے ہیں جو فقہ اسلامی سے وابستگی کی وہ سطح نہیں رکھتے جو ہر مسلمان کی ہونی چاہیے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کوئی ایسا نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے جو ضرورت سے زیادہ رخصت یا غیر ضروری تخفیف پر مبنی ہو تو اس کے اثرات بھی بہت جلد پوری دنیائے اسلام میں پھیل جاتے ہیں۔ اس لیے آج کل کے حالات میں یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی خاص اسلوب یا طرزِ اجتہاد کی پیروی کو اس طرح لازمی قرار دیا جائے جس طرح آج سے نو سو سال پہلے لازمی قرار دیا گیا تھا۔ (۱۲)

اسی مقدمے کو وسعت دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف فقہ آفاقی یعنی ان کی اپنی زبان میں 'کاسموپولیٹن فقہ' کی ضرورت اور اہمیت کا ادراک بروقت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر غازی صاحب کی نظر سماجی علوم (Social Sciences) کی کم و بیش ہر شاخ پر ناقدانہ رہی ہے۔ علوم اسلامیہ اور اس کے متعلقات تو ان کی توجہ کا خصوصی محور رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فقہ آفاقی کی اصطلاح محض اس وجہ سے استعمال نہیں کرتے کہ دنیا ایک عالمی گاؤں بن چکی ہے، یا لوگوں میں بُعد کم ہوتے ہوتے قُرب میں بدل چکا ہے یا ٹیکنالوجی کے تیز رفتار پہیے نے انسانی زندگی کے تحرک

کی نوعیت بدل دی ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک طرف دستوری قانون پر گہری نظر رکھتے ہیں تو ماوراء الاقوام عالمی تجارتی امور بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے اور دستور اور دستوری مباحث تو ان کی توجہ کا خصوصی مرکز رہے۔ ایک دوسری جگہ آپ فرماتے ہیں:

> دورِ جدید میں اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں غور وخوض ہو رہا ہے۔ اسلام کی دستوری فکر پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ مختلف مسلم ممالک میں دستوری تصورات پر مباحثے ہو رہے ہیں۔ اور ایسی دستاویزات اور تحقیقات سامنے آ رہی ہیں جن کا مقصد اس دور کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اسلام کے دستوری اصولوں اور سیاسی تصورات کی بنیاد پر ایک نئے دستوری اور سیاسی نظام کی تشکیل ہے۔ یہ کام پاکستان میں بھی ہو رہا ہے۔ مصر اور دوسرے عرب ممالک میں بھی ہو رہا ہے۔

ان میں سے کسی کام کو حنفی یا شافعی یا حنبلی یا مالکی مسلک کی حدود میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت دنیائے اسلام میں ''اسلامی دستور سازی'' کا کام ہو رہا ہے۔ ''حنفی دستور سازی'' یا ''مالکی'' اور ''حنبلی دستور سازی'' کا کام نہیں ہو رہا ہے۔ پاکستان میں اگر اسلامی دستور کی طرف پیش رفت ہوئی ہے تو وہ اسلامی دستور کی طرف پیش رفت ہوئی ہے، کسی حنفی یا مالکی دستور کی طرف پیش رفت نہیں ہوئی ہے (۱۳)

یہ کیفیت فقہ اسلامی کے کسی ایک باب تک محدود نہیں ہے۔ اس کا دائرہ ہر آنے والے دن سے وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کیفیت کو نہ صرف عائلی قوانین کے ضمن میں دیکھا جا سکتا ہے بلکہ اس کا مشاہدہ بینکنگ، انشورنس، عالمی تجارت، اقتصادی امور اور حدود وتعزیرات سے لے کر معاملات کی ہر نوع میں کیا جا سکتا ہے۔ ان سب کا خلاصہ ڈاکٹر صاحب موصوف ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

> یہ سارے قواعد وضوابط جو دنیا بھر میں وضع ہو رہے ہیں۔ ان سب میں ایک دوسرے سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں ہونے والے کام کے اثرات مصر اور سعودی عرب میں پڑ رہے ہیں۔ مصر اور سعودی عرب میں جو تحقیق ہو رہی ہے اس سے پاکستان استفادہ کر رہا ہے۔ اس لیے یہ سارا کام ایک مشترکہ تصور اور مشترک اقدار اور اصولوں کی بنیاد پر کیا جا رہا ہے۔ ان میں کسی متعین فقہی مسلک کی پیروی نہیں کی جا رہی ہے۔ چنانچہ ایران میں بلاسود بنکاری کا جتنا کام ہوا ہے۔ وہ سارے کا سارا قریب قریب اسی انداز کا ہے جس انداز کا

> پاکستان میں ہوا ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ مسائل ہیں جن میں کسی فقہی اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے۔ جو چیزیں شریعت میں حرام ہیں، وہ سب کے نزدیک حرام ہیں۔ ربٰو، غرر، قمار سب کے نزدیک حرام ہے۔ شریعت کی حدود کے اندر کاروبار کی جو جائز شکلیں ہیں، وہ تقریباً ایک جیسی ہیں۔ اس لیے فقہ اسلامی کا یہ نیا ارتقاء اور یہ نیا رجحان مسلکی نہیں، بلکہ مسلکی حدود سے ماوراء ہے۔ اس لیے آئندہ آنے والے سال، عشرے یا صدی مسلکوں کی صدی نہیں ہوگی بلکہ یہ فقہ اسلامی کی مشترک صدی ہوگی۔ اس لیے آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ فقہ اسلامی کے طلبہ فقہی ذخائر سے واقف ہوں۔ کم از کم مطالعہ اور واقفیت کی حد تک ایک متعین مسلک میں محدود نہ رہیں۔ ان کو تمام فقہی اسلوب اجتہاد سے واقفیت ہونی چاہیے۔ وہ یہ جانتے ہوں کہ فقہ مالکی کے بنیادی تصورات اور قواعد کیا ہیں۔ فقہ حنبلی اور دوسرے اہم فقہی مسالک اور اجتہادات کے بنیادی تصورات اور قواعد کیا ہیں۔
>
> جب تک یہ بنیاد علمی اعتبار سے مضبوط نہیں ہوگی۔ اس وقت تک آئندہ آنے والی صدی یا آئندہ آنے والے عشروں میں اس کام کو آگے بڑھانا مشکل ہوگا۔ (۱۴)

یہاں اس بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کی مندرجہ بالا اور بعض دیگر تحریروں میں بالعموم اُن امور کا احاطہ کیا گیا ہے جن پر مختلف ممالک میں ریاستی سطح پر یا ان ممالک کے ریاستی اداروں کی سطح پر گفتگو ہوتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر دستوری امور یقیناً ریاستی سطح پر حل ہوتے ہیں۔ اِسی طرح انشورنس، بینکاری اور ریاستی اقتصادی امور حکومتی سطح پر طے ہوتے ہیں۔ اپنی کئی تحریروں میں آپ رحمہ اللہ قوانین کو اسلامیانے کے عمل کا تذکرہ کرتے وقت بالعموم ریاستی کوششوں اور اداروں کے حوالے دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان کی نسبت سے قراردادِ مقاصد، بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ، پاکستان کے مختلف دساتیر، اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت، قصاص و دیت کے قوانین، زکوٰۃ و عشر آرڈیننس اور انصاری کمیشن اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ دیگر ممالک کی مثالیں دیتے وقت آپ سلطنت عثمانیہ کے مجلّہ الاحکام العدلیہ، اردن کے القانون المدنی، سعودی عرب میں ''نظام'' کے تجربے اور اجتماعی لیکن غیر ریاستی سطح پر اسلامک کونسل آف یورپ کے مسودۂ دستور کا ذکر کرتے ہیں۔ (۱۵)

فقہ آفاقی اور تقنین

اس سے یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ شاید آپ اسلامی قانون کی تقنین کے ضمن میں حکومتی کوششوں کے داعی ومؤید ہیں جبکہ اسلامی قانون پوری اسلامی تاریخ میں غیر حکومتی وغیر ریاستی سطح پر فروغ پاتا رہا۔ یہ اتنا نازک اور حساس عمل ہے کہ مسلمان اس بارے میں کوئی مفاہمت کرنے کو کبھی تیار نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری اسلامی تاریخ فقہ اسلامی کے نشوونما کے حوالے سے آج کل کی زبان میں نجی شعبے کی مرہونِ منت رہی ہے۔ جہاں کہیں اس کام میں حکومتی یا ریاستی عمل دخل شروع ہوا، مسلمانوں نے بلا تامل اسے رَد کر کے علماء حق کے کندھے سے کندھا ملا کر اس عمل کو بلا تعطل جاری رکھا۔ ڈاکٹر صاحب اس حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> اسلامی تاریخ میں شوریٰ بھی رہی، اہل اختیار کے ادارے بھی رہے اور اہل حل وعقد بھی موجود رہے، لیکن ان میں سے کسی کو بھی قانون سازی کا کوئی اختیار inherent کبھی بھی حاصل نہیں ہوا۔ ان اداروں کو دور جدید کی پارلیمنٹ کا پیش رو قرار دینا بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اسلامی تاریخ میں مغرب کے اثرات سے پہلے کبھی بھی قانون سازی کے لیے کوئی سرکاری یا باقاعدہ ادارہ وجود میں نہیں آیا۔ مسلمانوں کے مزاج نے ایسے اداروں کے قیام کو آزادی قانون کی روح کے خلاف سمجھا۔ امام مالکؒ نے اسی لیے عباسی خلفا کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا تھا کہ ان کی مؤطا کو ملکی قانون کا درجہ دے دیا جائے۔ امام مالک نے اپنی ذاتی شہرت اور دنیاوی کریڈٹ کو یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس سے فقہا کی وہ آزادی محدود ہو جائے گی جو اسلام نے ان کو دی ہے۔

ممکن ہے آج بعض حضرات کو یہ سمجھنے میں دِقت ہو کہ ریاست کے ٹھپے کے بغیر قانون کیسے بن اور چل سکتا ہے۔ اس دِقت کی ایک وجہ تو وہ تصورات اور رواجات ہیں جو آج مغربی روایات کے اثر سے ہمارے ہاں عام ہو گئے ہیں، جن کی رو سے قانون وہی ہے جو کسی فرماں روا یا بالاتر حکمران نے جاری کیا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کے اس خصوصی مزاج پر غور نہیں کیا گیا۔ ذرا توجہ سے دیکھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ آج بھی دنیائے اسلام میں اسلامی قانون کے ایک بڑے حصے پر کسی سرکاری مداخلت اور ریاستی اثر ورسوخ کے بغیر عمل درآمد ہو رہا ہے۔(۱۶)

فقہ اسلامی کی آئندہ شکل: فقہ آفاقی

ارتعاش اور تزلزل سے معمور اس عہد کے مسائل، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، مطلقاً بدل چکے ہیں۔ دنیا عالم

گیریت کے پنجرے میں بند ہو کر نت نئے مسائل کی اسیر ہو چکی ہے۔اس دور میں زمینی فاصلے کم ہو جانے کے باعث انسان قریب آ چکے ہیں۔اس قربت کے نتیجے میں کم وبیش تمام فقہی مسائل کے پیروکار باہم معاملات کرتے ہیں۔کسی خاص فقہ کی اہمیت وضرورت سے انکار ممکن نہیں لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ لین دین کرنے والے افراد باہمی قرب کے باعث کسی ایک فقہ پر نہ تو عمل کر سکتے ہیں اور نہ اپنی فقہ کے دائرے سے بآسانی باہر نکلنے کو تیار ہوتے ہیں۔اس حالت میں فقہی کرّے ہی میں رہنے والوں پر ذرا نظر ڈالی جائے تو ان فقہی موضوعات کا دائرہ دن بدن سکڑ رہا ہے۔ ریاستی امور اور بین الریاستی تجارت سے متعلقہ موضوعات کا جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دائرہ دن بدن پھیلتا جا رہا ہے اور اس قدر پھیل چکا ہے کہ اب ان مسائل کا حل کسی ایک فرد واحد یا انفرادی فقہ کے پاس نہیں ہے۔اب مکاتب فکر اپنی جداگانہ حیثیت میں نہ تو ان مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں اور نہ یہ مسائل طویل عرصے تک کسی خاص مکتب فقہ کی توجہ کے منتظر رہ سکتے ہیں۔ بلکہ صورت واقعہ تو یہ ہے کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا کے مصداق اب مسائل اتنی تیز رفتاری سے اپنا چولہ بدل رہے ہیں کہ لاتعلق رہنے والے تاریخ کا حصہ تو بن سکتے ہیں، استقبال میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی فرماتے ہیں:

> گزشتہ سوسوا سو برس کے تجربے نے یہ بتایا ہے اور ہر آنے والا دن اس تجربہ کی صداقت کی گواہی دے رہا ہے کہ آئندہ دور مختلف فقہی مسالک میں محدود رہنے کا دور نہیں ہے بلکہ ان مسالک کو اجتماعی طور پر مسلمانوں کی مشترکہ میراث قرار دینے اور ان سب کو ساتھ لے کر چلنے کا دور ہے۔آئندہ جو فقہ سامنے آنے والی ہے وہ صرف اور صرف عالم گیر فقہ اسلامی ہوگی۔وہ فقہ حنفی، مالکی، شافعی یا حنبلی فقہ نہیں ہوگی۔آج ایک آفاقی (Cosmopolitan) فقہ وجود میں آ رہی ہے جس میں مسلمانوں کے پورے فقہی ذخیرے کو سامنے رکھ کر نئے انداز سے احکام مرتب کیے جا رہے ہیں۔ایسے احکام جن میں فقہ اسلامی کے پورے ذخائر سے کام لیا جا رہا ہے اور جن میں شریعت کے مقاصد اور قرآن وسنت کی نصوص کو اولین اور اساسی حیثیت حاصل ہے۔اس عالم گیر فقہ کی صحیح اسلامی خطوط پر تدوین دورِ جدید کی سب سے بڑی اور سب سے بنیادی ضرورت ہے۔(۱۷)

ڈاکٹر غازی صاحب جب فقہ اسلامی کی اس نئی شکل کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے مسائل کو کلیتاً لے رہے ہیں۔ان کے خیال میں چند بنیادی امور کی طرف توجہ دی جائے تو بہت سے

مسائل پیدا ہی نہیں ہوں گے۔ اپنی ایک دوسری مطبوعہ تقریر میں وہ فرماتے ہیں:

''اس معاملے کا ایک اور اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آج کے حالات کی مناسبت سے مسلم معاشرے اور مسلم ریاست کی تجدید نو کی جائے اور جدید معروضی حقائق اور فکری مباحث کے پس منظر میں واضح کیا جائے کہ اسلامی معاشرے کی تعریف کیا ہے اور اسلامی ریاست آج کے سیاق وسباق میں کس ریاست کو کہا جائے گا۔ اس بات کی ضرورت اس لیے پیش آ رہی ہے کہ فقہائے اسلام نے آج سے کم وبیش ایک ہزار دوسو سال قبل دارالاسلام، دارالحرب اور دارالصلح وغیرہ کی جو حد بندیاں تجویز کی تھیں، وہ آج کے زمینی حقائق کی روشنی میں اجنبی معلوم ہوتی ہیں۔ خود فقہائے اسلام کو ابتدائی دو تین صدیوں میں ہی ان تقسیمات پر کئی بار از سر نو غور وخوض کرنا پڑا۔ دوسری صدی ہجری کے نصف اوّل کے زمینی حقائق کی روشنی میں امام ابوحنیفہؒ (متوفی ۱۵۰ھ) کے فہم اسلام کی رو سے روئے زمین کو صرف دو حصوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے تھا، یعنی دارالحرب اور دارالاسلام، لیکن جلد ہی امام شافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ) بلکہ خود امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ کو اس تقسیم پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے دارالاسلام اور دارالحرب کی دوگانہ تقسیم کے مابین دارالعہد اور دارالصلح کی درمیانی تقسیمیں تجویز کرنا ضروری سمجھا۔ کچھ اور بعد کے فقہاء نے دارالعدل، دارالبغی اور ایسی ہی دوسری تقسیموں کی ضرورت محسوس کی۔ آج کے بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں جدید زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ان تمام تقسیموں پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔'' (۱۸)

ان حالات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جس مسئلے کی طرف ڈاکٹر صاحب موصوف اشارہ کر رہے ہیں وہ نہ تو چند اصحاب رائے کی توجہ سے حل ہو سکتا ہے اور نہ یہ کام دو چار سال میں ہو جانے والا ہے بلکہ اس کے لیے طویل ریاضت اور پِتّہ ماری درکار ہے جس کے نتائج شاید عشروں بعد سامنے آئیں۔

فقہ آفاقی کا ایک مختصر ناقدانہ جائزہ

مسائل کی نوعیت بدل جانے سے ان کے حل کے وسائل واسباب بھی بدل جاتے ہیں لیکن تفکر وتعقل سے معلوم ہوتا ہے کہ نئے مسائل کے حل کے لیے جدید اسباب ووسائل کا دوسرا سرا کسی نہ کسی شکل میں ماضی سے لازماً جڑا ہوتا

ہے۔جس کیفیت کوڈاکٹر غازی صاحب رحمہ اللہ فقہ آفاقی کا نام دے کر بظاہر لوگوں کو چونکا رہے ہیں، فی الاصل وہ کوئی چونکا دینے والی بات نہیں ہے۔ ذرا غور کیا جائے تو ماضی میں اس کے مختلف نام سامنے آ چکے ہیں اور اصول فقہ کے طالب علم اس کیفیت سے ناواقف نہیں ہیں۔مثلاً عقد نکاح کے لیے لازم ہے کہ عورت کے ایجاب وقبول کے ساتھ اس کے ولی کی موافقت (Concurrence) ہو۔نہ ہونے پر عقد نکاح فاسد قرار پاتا ہے۔نکاح فاسد ہو تو فقہ مالکی کے تحت عورت حق مہر اور حق اِرث سے محروم قرار پاتی ہے۔فقہاء کے خیال میں یہ شئے بالآخر مفسدہ کی طرف لے جاتی ہے۔اس مفسدہ سے بچنے کی خاطر مالکی فقہاء،فقہاء احناف کا فتویٰ لے کر اسے حق مہر اور حق اِرث دونوں دلاتے ہیں۔ اس نظریے کو مراعاۃ الخلاف کہتے ہیں۔امام شاطبی کے نزدیک اس نظریے کی تعریف یوں ہے:

((و ھذا منه مبنی علی مراعاۃ المآل فی نظر الشارع فالمراد مراعاۃ الخلاف الواقع بین المجتھدین)) (۱۹)

''شارع کے خیال میں کسی شے کے بالآخر انجام کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔پس مراعات الخلاف سے مراد وہ اختلاف ہے جو مجتہدین کے مابین ہو۔''

نظریہ مراعاۃ الخلاف ایک ہمہ جہت علم ہے جس کے اصول وقواعد منقح ہو چکے ہیں۔اس نظریے کے تحت اگر کوئی فقیہ کسی مفسدہ کی صورت میں کسی اور فقہ سے کسب واکتساب کرے تو اس کی وجہ سے وہ اپنی فقہ کا تارک قرار نہیں پاتا بلکہ یہ وہ فقہی حسن وخوبی ہے جس سے فقیہ گویا درآمدی مال سے اپنی مصنوعات مزین کرتا ہے۔نظریہ مراعات الخلاف محض دو ایک فتاویٰ تک محدود نہیں ہے بلکہ اسلامی قانون کا ہمہ گیر اور ہمہ جہت مطالعہ کرنے سے اس کے مختلف النوع رنگوں کی ایک دلفریب دھنک ہر طرف دیکھی جا سکتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے طول عرض میں فقہ حنفی کے پیروکار آباد ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ پر کہا جا سکتا ہے کہ اس خطۂ ارض میں فقہِ حنفی کے کروڑوں پیروکاروں کے مقابلے میں فقہ مالکی کے پیروکار شاید سینکڑوں ہزاروں سے متجاوز ہرگز نہیں ہیں۔لیکن گزشتہ صدی کے نصف اوّل میں حکومتی سطح پر تحلیل وتنسیخ نکاح (Dissolution of Marriage) پر جب قانون سازی ہو رہی تھی تو کم وبیش سو فی صد احناف اہل سنت والجماعت آبادی پر مشتمل اس برصغیر میں مفقود الخبر شوہر کا نکاح تحلیل کرنے کے لیے وہ مدت انتظار احناف بھی اختیار نہ کر سکے جو فقہ حنفی کا طرۂ امتیاز ہے۔اسی نظریہ مراعات الخلاف کی مدد سے انہوں نے فقہ مالکی سے رجوع کیا اور مفقود الخبر شوہر کی بیوی کے لیے انتظار کی مدت چار سال قانون وضعی کا جزو قرار پائی۔ یہ قانون انگریزوں کے رخصت ہو جانے کے بعد آج بھی برصغیر میں اسی طرح رائج ہے اور پاک و ہند میں احناف منصفین بھی اس حد تک فقہ مالکی کے

مطابق فیصلہ دیتے ہیں۔(۲۰)

اس ایک مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اپنی اس موجودہ شکل میں فقہ آفاقی کا تصور یقیناً ایک نیا تصور ہے، اس کے مالہ اور ماعلیہ ابھی منقح ہو کر سامنے نہیں آئے اور نہ یہ تصور ابھی بڑے پیمانے پر متعارف ہونے میں کامیاب ہوا ہے۔لیکن اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اس سے ملتا جلتا تصور ماضی میں نہیں تھا تو یہ صحیح نہیں ہوگا۔اپنی فقہ کے اندر رہ کر دوسری فقہ کا سہارا لینا اگر مراعات الخلاف کہلاتا ہے تو اصول فقہ کے طلباء تلفیق سے بھی ناواقف نہیں ہیں۔تلفیق کے دو پہلو قابل ذکر ہیں: عوام کی سطح پر اگر کوئی اپنی مرضی کے تحت الل ٹپ طریقے سے اپنی فقہ کے باہر جا کر کہیں اور سے کچھ اخذ و اختیار کرے تو تلفیق کا یہ انداز فقہا کے ہاں کبھی مستحسن نہیں رہا۔فقہاء اسے ہوائے نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔لیکن یہی طریقہ بغرض قانون سازی فقہاء اختیار کریں تو اسے بھی تلفیق کہا جاتا ہے اور قانون سازی کی راہ میں حائل رکاوٹ دور کرنے کے ضمن میں یہ ایک مؤثر اصول ہے۔

فقہ آفاقی کا موجودہ مرتبہ و مقام

لیکن ان دونوں تائیدی شواہد کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ فقہ آفاقی ابھی تک بالکل اپنے عہد طفولیت سے نہیں نکلی۔اپنی اس حالت میں بھی یہ اپنے اہل خانہ (علماء اصول) ہی کی توجہ حاصل کر پائی ہے۔یہ ابھی تک کوئی ایسا ادارہ بننے میں کامیاب نہیں ہو سکی جو اہل علم کی پہلی صف سے ذرا نیچے دوسرے درجے کے اہل علم میں متعارف ہو چکی ہو۔رہے عوام اور عام اہل علم تو وہ تا ایں دم اس سے مطلقاً ناواقف ہیں۔ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے فقہ آفاقی کے ابتدائی ارتعاش کو محسوس کر کے مستقبل کا نوشتۂ دیوار (Inevitibility) بروقت پڑھ لیا ہے۔

محولہ بالا اقتباسات میں ایک جگہ ڈاکٹر غازی صاحب رحمہ اللہ نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ ''جو چیزیں شریعت میں حرام ہیں وہ سب کے نزدیک حرام ہیں۔'' اپنی موجودہ شکل میں فقہ آفاقی بالعموم ان موضوعات سے عبارت ہے جن پر تمام فقہائے اسلام کا اتفاق ہے یا کم از کم ان میں ان موضوعات پر عدم اتفاق نہیں ہے۔اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ عہدِ حاضر کے مجتہدین نے بالعموم متفق علیہ امور سے کام کا آغاز کیا ہے۔لیکن یہ بات مکمل طور پر درست نہیں ہے بلکہ مسائل کا جبر فقہاء کو اس مقام پر لے آیا ہے جہاں وہ اختلافی امور والے کوچے میں قدم رکھنے کے روادار نہیں ہیں۔یوں

فقہ آفاقی کی موجودہ شکل ابھی تک زیادہ تر متفق علیہ امور پر مبنی ہے۔

فقہ آفاقی کے موضوعات پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے بالعموم موضوعات وہ ہیں جن میں ریاستی عمل دخل بدیہی امر ہے بینکاری، انشورنس، بین الاقوامی تجارت اور بلاسود سرمایہ کاری وہ امور ہیں جن پر موجودہ حالات میں ریاست ہی قانون سازی کرسکتی ہے۔ پس کہا جاسکتا ہے کہ فقہ آفاقی کا کام ابھی تک سرکاری شعبے میں ہوا ہے اور یہ کہ اس کے موضوعات میں عبادات اور مناکحات جیسے انفرادی وشخصی عنوانات داخل نہیں ہو سکے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فقہ آفاقی کے متعلق تحریری مواد بہت کم ملتا ہے جس کے سبب فقہ آفاقی ابھی تک علمی سطح پر کچھ زیادہ توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی ہے۔

فقہ آفاقی ابھی تک اپنے اصول فقہ سے بھی محروم ہے۔ گمان غالب ہے کہ سو دوسو سال کے طویل دورانیے کے بعد اس فقہ کا کوئی امام کرخی فقہ حنفی کے اصولوں کی طرح اصول فقہ آفاقی مرتب کرے گا جس کے بعد اس فقہ کے کسر و انکسار کا دوسرا دور شروع ہوگا۔ (۲۱) موجودہ صورت حال میں اس فقہ کا رتبہ دیگر مکاتب فقہ کی طرح مسلمہ نہیں ہے ، باوجودیکہ ہر آنے والے دن میں اس کا رنگ گہرا ہوتا جارہا ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی بلاشبہ وہ فیلسوف عہد حاضر ہیں جنہوں نے گزشتہ سو ڈیڑھ سو سال کے عرصے پر محیط فقہ اسلامی کے اس سارے ذخیرے پر جزرسی سے نظر ڈال کر یہ اندازہ کرلیا کہ تمام اسلامی بلاد وامصار اب ایک ہی رجحان کے اسیر بنتے جارہے ہیں جسے انہوں نے فقہ آفاقی کا نام دیا۔

اِتنا کچھ لکھنے کے باوجود احساس تشنگی ابھی تک قائم ہے۔ مقالے کی محدود ساخت کے اندر رہتے ہوئے اس سے زیادہ کچھ لکھنا ممکن نہیں ہے۔ توقع ہے کہ سطورِ گزشتہ کی روشنی میں کوئی ثقہ بند طالب علم اس موضوع کو اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان بنا کر فقہ آفاقی کے مزید پہلوؤں پر روشنی ڈالے گا۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) قارئین خاطر جمع رکھیں، لفظ ناقدانہ ''ضرورت شعری'' کی مقتضیات میں سے ہے، ورنہ پیرومرشد اور اس خاکسار میں سورج اور چراغ کی نسبت بھی شاید بروزن بیت ہی ہو۔

(۲) زمانے کے بدلنے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔ مشہور فقہی قاعدہ ہے۔

(۳) Sir Mohammad Iqbal, *Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Lahore, 1960, Shaikh Muhamad Ashraf, p.7

(۴) شیخ عطا اللہ، شیخ: اقبال نامہ مجموعہ مکاتیبِ اقبال، لاہور، ۲۰۰۵ء اقبال اکیڈمی، ص ۹۹۔۹۸

(۵) مجتہد مطلق مستقل ایسے مجتہد کو کہتے ہیں جس کے اپنے وضع کردہ اصول وقواعد ہوں اور وہ کسی اور مجتہد کی اتباع نہ کرتا ہو۔ ائمہ اربعہ، ابن حزم اور امام اوزاعی اس کی مثالیں ہیں۔ تفصیل کے لیے کتب اصول فقہ ملاحظہ ہوں۔ احمد حسن کی جامع الاصول بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

(۶) غزالی، ابی حامد بن محمد: **المستصفیٰ من علم الاصول**، المطبعہ الامیریہ، بولاق، مصر ۱۳۲۴ھ، ج ۲، ص ۳۵۳

(۷) ملاحظہ ہو: **ارشاد الفحول إلی تحقیق الحق من علم الاصول**، محمد بن علی بن محمد شوکانی، دارالکتاب العربی، بیروت، ۲۰۰۱ء، ج ۲، ص ۲۱۶۔۲۱۷

(۸) سید مودودی نے ہیگل کے اس فلسفے کا ناقدانہ جائزہ لے کر اسے رد کر دیا ہے۔ یہ نظریہ ایک کُل کی طور پر لیا جائے تو سید مودودی کا نقطۂ نظر درست معلوم ہوتا ہے لیکن مسئلے کی نوعیت کو ذرا وسعت دے کر اسے اسلامی اصولِ ثبات وتغیر کی روشنی میں پرکھا جائے تو فکر کی نئی راہیں سامنے آتی ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، تفہیمات از سید ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور، حصہ دوم، اسلامک پبلی کیشنز، ص ۲۶۳

(۹) روح عصر کا فلسفہ جاننے کے لیے ہیگل کی تصانیف Phenomenology of Spirit اور Encyclopaedia of Philosophical Sciences ملاحظہ ہوں۔ موجودہ مغربی فکر کی اٹھان بڑی حد تک اسی فکر سے مواد لیے ہوئے ہے۔

(۱۰) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر: محاضراتِ فقہ، لاہور، ۲۰۰۵ء، الفیصل ناشران، ص ۵۴۳

(۱۱) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر: ایضاً، ص ۵۴۳

(۱۲) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر: تقنین (اسلامی احکام کی درجہ بندی)، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ص ۴۷

(۱۳) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر: محاضرات فقہ، ایضاً، ص ۴۷۷

(۱۴) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر: ایضاً، ص ۴۷۸

(۱۵) ملاحظہ ہو موصوف کی ایک تحریر بعنوان "تقنین (اسلامی احکام کی درجہ بندی)" اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

(۱۶) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر: اسلام کا قانون بین الممالک (خطبات بہاول پور۔۲)، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ص ۶۔۴۵

(۱۷) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر: تقنین (اسلامی احکام کی درجہ بندی)، ایضاً ص ۴۶

(۱۸) عزیز الرحمٰن، سید ڈاکٹر: مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم (خطبات وتقاریر ڈاکٹر محمود احمد غازی)، گوجرانوالہ، ۲۰۰۹ء، الشریعہ اکیڈمی، ص ۹۔۱۴۸

(۱۹) شاطبی، ابواسحٰق ابراہیم بن موسیٰ: الموافقات فی اصول الشریعة، بیروت، دارالمعرفہ، ج ۴، ص ۲۰۲

(۲۰) ملاحظہ ہو: Dissolution of Muslim Marriage Act 1939

(۲۱) فقہ حنفی کے مشہور امام جنہوں نے فقہ حنفی کا نچوڑ ۳۹ قواعد کی شکل میں نکالا۔